اسلامی اقدار کا نقیب

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور

مجلس

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہ

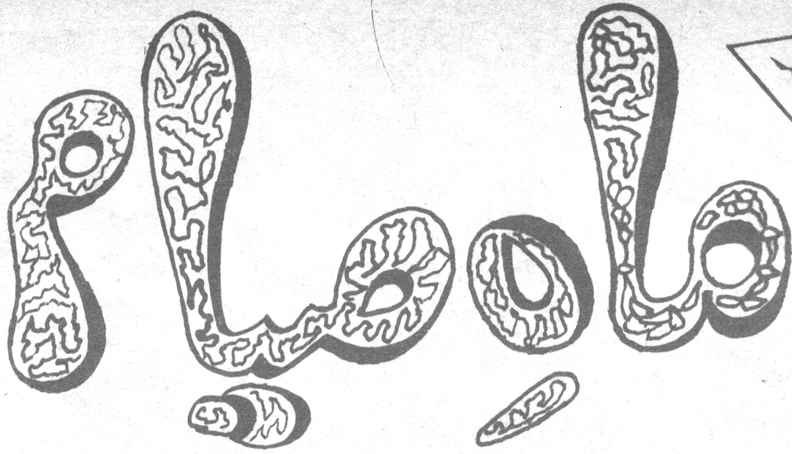
۲۶ اگست ۷۷

ج ۲۵
ش ۳۷



اسلامی نظامِ عدل نافذ کیے بغیر پاکستان کے مسائل حل نہیں ہوسکتے

مولانا مفتی محمود



محمد افتخار فخرؔ

اہلِ تقویٰ کیلئے ہے برکتِ ماہِ صیام
روح پرور، جاں فزا ہے رحمتِ ماہِ صیام

تیس دن کی ہے فقط یہ قربتِ ماہِ صیام
دل میں رہ جائیگی باقی حسرتِ ماہِ صیام

اس مبارک ماہ میں قرآن بھی نازل ہوا
مومنوں کے دل سے پوچھو عظمتِ ماہِ صیام

ہے یقیں کامل ملے گی اسکو دوزخ سے نجات
جس نے بھی بھرپور کی ہے خدمتِ ماہِ صیام

قلب ہو جاتا ہے آمادہ عبادت کے لیے
ولولہ انگیز بھی ہے ندرتِ ماہِ صیام

پختہ تر کرتا ہے روزہ اور بھی ایمان کو
ہے نمازِ پنجگانہ طاقتِ ماہِ صیام

صوم، عزمِ بے کراں دیتا ہے روزہ دار کو
دین و ایماں کا نشاں ہے رفعتِ ماہِ صیام

فخرؔ اس جیسا تونگر کون ہے اس دہر میں
جس کی قسمت میں لکھی ہو دولتِ ماہِ صیام

اداریہ

مجرموں کو چھوٹ کیوں؟

مسٹر بھٹو کا چھ سالہ ظالمانہ دورِ حکومت جیسے کیسے بھی گزرا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اس دور کے آخر میں فقید المثال ملک گیر تحریک چلی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وسعت اختیار کرتی چلی گئی۔ اقتدار سے چمٹا رہنے کے لیے بھٹو نے ہزار جتن کئے مگر کوئی تدبیر کوئی فریب اور کوئی ہتھکنڈہ کارگر ثابت نہ ہوا، آخری مرحلے پر تو ایک سازش کے تحت مسٹر بھٹو نے مسلح افواج اور عوام میں براہ راست تصادم کا منصوبہ بنا کر عوام اور محب وطن مسلح افواج میں نفرت و حقارت کی خلیج حائل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ہوا وہ جو قدرت کو منظور تھا۔

۵ جولائی کو جناب بھٹو کو اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ان کی اس علیحدگی پر نہ تو ہمالہ ہی نے خون کے آنسوں بہائے اور نہ ہی بقول ان کے کراچی سے خیبر تک سوگ منایا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس پورے ملک میں ہفتہ نجات منایا گیا ہر چھوٹے بڑے شہر کے گلی کوچوں میں حلوے کی دیگیں پکائی گئیں اور منوں کے حساب سے مٹھائی تقسیم کی گئی۔

موجودہ عبوری حکومت کے دور میں عدلیہ اور اخبارات کو آزادی ملی تو مسٹر بھٹو اور ان کے حواریوں کے بھیانک چہروں سے پردہ اٹھا، راز ہائے درونِ پردہ سامنے آئے اور کسی حد تک قوم کو معزول حکمرانوں کے پوشیدہ کارہائے نمایاں کا علم ہوا،

اب صورتِ حال یہ ہے کہ بھٹو اور ان کی حکومت کے کارپرداروں کے روز آنہ کئی کئی مقدمات عدالتوں میں درج ہو رہے ہیں، اب تک جتنی عدالتی کاروائیاں سامنے آئی ہیں ان سب میں مسٹر بھٹو ان کے وزراء اعلیٰ اور وفاقی و صوبائی وزراء کا براہ راست ہاتھ پایا جاتا ہے، اور دراصل تو وزراء اور وزراء اعلیٰ کی حیثیت بھی ان تمام کارستانیوں میں ایک واسطے کی ہے جرائم کا اصل منبع و مصدر خود معزول بھٹو کی اپنی ذات ہے

بھٹو کے ظالمانہ اور آمرانہ دور اقتدار میں جتنے بھی سیاسی قتل ہوئے بے گناہ لوگوں کو حوالہ زنداں کیا گیا جتنے لوگوں پر جھوٹے مقدمات قائم گئے اور جس جس پر جو جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ان سب کی ذمہ داری بھٹو پر عائد ہوتی ہے۔ ان جرائم میں بعض ایسے گھناؤنے جرم بھی ہیں سراسر ننگ انسانیت ہیں۔ مثلاً بھٹو کا اپنے اہل کاروں کو یہ حکم دینا کہ جے۔ اے۔ رحیم کے لڑکے سے ان کی موجودگی میں خلاف وضع فطری فعل کیا جائے اور اسی طرح سے یہ کہ ملک سلیمان کی نوجوان کنواری لڑکی سے منہ کالا کر کے خاص حالت کی تصویریں معزول وزیر اعظم کو بھیجی جائیں تا کہ اس درندہ صفت انسان کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو سکے۔

اس کے علاوہ بھی بھٹو کے ایسے ہزاروں گھناؤنے جرائم ہیں جو اب منظر عام پر آرہے ہیں، اور مزید آنے کی توقع ہے قومی خزانے کو جس بے دردی سے اپنے تعلقوں میں بھٹو اور اس کے چالیس چوروں نے اڑایا وہ بھی اب کوئی راز سربستہ نہیں رہا جنہوں نے قوم کو کنگال کر دیا مگر سوائے زمانہ سابقہ برسر اقتدار تعیش کوشیوں اور مستیوں میں گم رہے۔ اس غاصب و ظالم لٹیرے اور اس کے گرو گھنٹیاں کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی کا عالم یہ ہے کہ تمام تر کرتوتوں کے باوجود مزدور کسان اور غریب عوام کے نام کی جھوٹی مالا جپتا رہا، غضب بالائے غضب یہ کہ آج بھی یہ لوٹا غریب غریب کے نعرے لگا کر ایک مرتبہ پھر قوم کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

جب کہ پوری قوم اس مطالبے میں یک زبان ہے کہ بھٹو اور اس کے حواریوں کو فوراً گرفتار کیا جائے تمام جرائم سامنے آئے باوجود موجودہ حکومت جس قسم کی رواداری اعنا سے کام لے رہی ہے وہ کم از کم قوم کے جذبات و احساسات کے قطعاً برعکس ہے، لہذا ہم پوری پاکستانی قوم کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سے مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ ان قومی مجرموں کو مزید



جلد نمبر ۲۰ شمارہ نمبر ۳۴

جمعۃ المبارک ۱۰ رمضان ۲۶ اگست

سرپرست
مولانا عبید اللہ انور

مدیر
اکرام القادری

مدیر معاون
عمیر الہاشمی

بدل اشتراک
سالانہ
۴۵ — روپے
ششماہی
۲۳ — روپے
سہ ماہی — ۱۱/۵۰ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ

یکے از مطبوعات
جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

کتنے گھروں میں اندھیرا چھایا ہوا ہے

وقائع نگار خصوصی

حافظ عبدالرزاق ولد حاجی سردار محمد ساکن منڈی حاصل پور ضلع بہاولپور دانش کالج بھائی پھیرو ضلع قصور میں فسٹ ایئر کے طالب علم تھے اور ساتھ ہی ساتھ جامعہ مظہر العلوم بھائی پھیرو میں دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ موصوف کا قیام جامعہ مظہر العلوم کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اور جمعیتہ طلباء اسلام کا فعال رکن تھا۔

۱۲-۱۰-۷۶ کو انہیں اغوا کیا گیا تلاش بسیار کے باوجود کوئی سراغ نہ ملا تو ۱۱-۱-۷۷ کو تھانہ بھائی پھیرو میں زیر دفعہ ۳۶۴ ت پ پرچہ درج کرایا گیا جس کا نمبر ۵/۷۷ ہے۔

بھائی پھیرو کے ایس ایچ او مشتاق احمد نے (جو اب تھانہ سرائے مغل میں، تعینات تھا' جسے مارشل لاء اتھارٹی نے معطل کر کے اس کے خلاف کاروائی کا حکم دیا ہے) کوئی نہ چلنے دی۔ چنانچہ ۲۰-۳-۷۷ کو ڈی سی صاحب نے مشتاق احمد' ایس ایچ او کو بلا کر ہدایت کی کہ چار دن کے اندر اندر کاروائی کر کے میرے سامنے پیش کی جائے۔ اس چھٹی کا نمبر ۱۰۴۰ مؤرخہ ۲۰-۳-۷۷ تھا۔ یہ چھٹی حافظ عبدالرزاق کے والد نے دستی لے جا کر تھانہ میں دی۔ اس پہ کوئی کاروائی نہ ہوئی' چند روز کے بعد ڈی سی صاحب تبدیل ہو گئے اور معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ اس کے بعد ۲۶-۴-۷۷ کو آئی جی پنجاب کو درخواست دی گئی لیکن اس پہ بھی کچھ نہ ہوا۔

بھائی پھیرو کے ایک صاحب جن کا نام ندیم انجم ہے اور جو سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا اور وہاں کے پی پی پی کے ایک ذمہ دار ... اور ممبر اسمبلی رانا پھول محمد خان کے ... پ کا لڑکا تھا۔ ان سے حافظ صاحب کا بستہ برآمد ہوا۔ جو اب بھی تھانے میں موجود ہے۔ لیکن مبینہ طور پر چار ہزار روپے کی خطیر رقم رشوت لے کر معاملہ کو پھر دبا دیا گیا۔ جن لوگوں سے بستہ برآمد ہوا۔ ان کے خلاف ۶/۱۰/۷۷ کو زیر دفعہ ۳۶۴ پرچہ درج کرایا جن کے نمبر ۹۲/۹۳ ہیں۔ ان میں ندیم انجم کا بھائی محمد ... ولد محمد شریف ڈوگر ا... کے گروپ کا ایک اور لڑکا جتھے ... شاہ بھی شامل ہے۔

ان لوگوں کا کام مبینہ طور پر' بچوں کا اغوا' اور ان کی خرید و فروخت ہے لیکن پولیس ان کی پشت پناہی کرتی ہے اور مظلوموں کو ہی دباتی ہے۔

ابھی حال ہی میں خانپور ضلع رحیم یار خان کا ایک لڑکا صوبہ ولد غلام قادر ایک کیمپ (خرکار) سے بھاگ کر آیا ہے جو راولپنڈی کے قریب واقع ہے اس کا انچارج مبینہ طور پر گل خان پٹھان ہے۔ وہاں دو صد کے قریب اغوا شدہ لڑکے موجود ہیں۔ جن میں مبینہ طور پر حافظ عبدالرزاق بھی موجود ہے۔

موصوف کے والد نے مختلف اوقات میں قومی پریس کے ذریعہ اس ظلم و زیادتی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور حکومت سے استدعا کی کہ وہ ان کا لڑکا برآمد کرائے لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اب انہوں نے ۲۳/۷۷ کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون A پنجاب لاہور کو درخواست دی ہے جس میں تمام کوائف درج کر کے یہ استدعا کی گئی ہے کہ ان کی داد رسی کی جائے۔

ہمیں امید ہے کہ مارشل لاء کا مستعد عملہ اس سلسلے میں بھرپور دلچسپی لے کر ان درندہ صفت اور بدقماش افراد کو قرار واقعی سزا دے گا۔ اور مختلف گھروں کے نونہال اپنے گھروں میں واپس آجائیں گے!

رمضان اور قرآن

مولانا محمد عبدالشکور دین پوری!
صدر مجلس تحفظ حقوق اہل سنت

شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن

"مہینہ رمضان شریف وہ ہے جس میں قرآن پاک نازل ہوا"

۱۔ سید الشہور رمضان ہے۔ افضل الشہور رمضان ہے۔

۲۔ اسی ماہ میں قرآن مجید کی زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔

۳۔ اسی ماہ میں ایک نیکی پر ستر ثواب حاصل ہوتے ہیں۔

۴۔ اسی ماہ میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

۵۔ یہ وہ ماہ ہے جس میں جہنم کے در بند کر دیئے جاتے ہیں۔

۶۔ یہ وہ ماہ ہے جس میں شیاطین سرکش جکڑ دیئے جاتے ہیں۔

۷۔ اسی ماہ میں لیلتہ القدر ہزار ماہ سے افضل آتی ہے۔

۸۔ اسی رات جبرئیل علیہ السلام زمین پہ نازل ہوتے ہیں۔

۹۔ اسی ماہ میں اعتکاف مساجد میں بیٹھا جاتا ہے۔ رونق دین بڑھ جاتی ہے۔

۱۰۔ اسی ماہ میں قرآن مجید نازل ہوا۔ حضور نے جبرئیل

۱۱۔ یہ وہ ماہ ہے جس میں فطرانہ' غرباء کو دیا جاتا ہے۔

۱۲۔ یہ وہ ماہ ہے جس میں رات کو تراویح ادا کی جاتی ہے۔

۱۳۔ یہ وہ ماہ ہے جس میں دن کو روزہ رکھا جاتا ہے۔

بسلسلہ غلامی ہند کی دلخراش کہانی

الطاف الرحمٰن بنوی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور اس کی ناکامی

قسط نمبر ۶

اس کی بنیادی وجہ تو نفرت و عداوت کا وہی لاوا تھا۔ جو سالہا سال سے ملکی باشندوں کے دلوں میں سامراجیوں کے خلاف جوش مار رہا تھا مگر اس کی فوری وجہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ ۷ مئی ۱۸۵۷ء کو انگریز افسران نے ہندوستانی سپاہیوں میں جدید قسم کی رائفلیں تقسیم کیں جن میں چربی والے ایسے کارتوس استعمال کئے جاتے تھے جن کو رائفل میں ڈالنے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا فوج کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں کو یہ شکایت تھی کہ ان کارتوسوں کو گائے اور سؤر کی چربی لگائی جاتی ہے اور اس کو منہ لگانا وہ اپنے اپنے عقیدے کی رو سے سراسر حرام سمجھتے ہیں۔ لہٰذا افسران بالا کو مذکورہ کارتوس دانتوں سے کاٹنے کی بجائے کسی دوسرے طریقے سے استعمال کرنے کی تربیت دینی چاہیئے مگر سامراجی حکومت کے ظالم افسروں نے ان کی اسی جائز شکایت پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی

سرسید کے الفاظ میں بارود پہلے سے تیار تھی صرف شتابے کو آگ لگنا باقی تھا اور اس آگ کا سامان چربی والے کارتوس نے کیا۔

مجھے ایران نے کیا، نہ کیا شاہِ روس نے
انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے

چنانچہ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو پچاس ہندوستانی سپاہیوں نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا اسی انکار کی وجہ سے ان پر اسی قدر جبر و تشدد کیا گیا کہ دیکھنے اور سننے والوں کے دل کانپ اٹھے۔

سامراجی حکومت کے ان خوفناک مظالم سے دوسرے ہندوستانی سپاہی آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے انگریز افسران کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے مظلوم بھائیوں کو قید خانے سے نکال باہر کیا اس کے بعد وہ سب کے سب بغاوت کا پرچم لہراتے ہوئے وسطی ہندوستان کی مغل سلطنت کے صدر مقام دہلی کی جانب بڑھنے لگے راستے میں کافی محبان وطن ان کے ساتھ مل گئے اور دہلی تک پہنچتے پہنچتے ان حریت پسندوں کے چھوٹے سے گروہ نے اچھی خاصی فوج کی صورت اختیار کر لی دہلی پہنچ کر لال قلعہ کے سامنے انہوں نے آزادیٔ وطن کے فلک شگاف نعرے لگائے اور بہادر شاہ ظفر سے پرزور مطالبہ کیا کہ وہ سامراجیوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کرے۔

مغل سلطنت کا آخری فرمانروا بے حد کمزور ناتوان ہونے کے باوجود حریت پسندوں کی قیادت سنبھالنے پر رضامند ہو گیا اس اثنا میں اسے پتہ چلا کہ بخت خان بریلوی بہت سے حریت پسندوں کو لے کر دہلی وارد ہوا ہے اور اس کی جماعت میں تربیت یافتہ سپاہی، عالم دین، فنون جنگ کے ماہر اور دیگر ملکی امور کو سمجھنے والے روشن دماغ آدمی موجود ہیں یہ سن کر بہادر شاہ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا اس نے فوراً بخت خان کو حریت پسندوں کا سپہ سالار مقرر کیا

جنرل بخت خان اوائل جولائی میں دہلی پہنچا وہ اپنے ساتھ منظم فوج لایا تھا اور اسے چھ مہینے کی تنخواہ پہلے ادا کر دی تھی ساز و سامان بھی ساتھ لایا تھا اور روپیہ بھی خزانۂ سرکار میں داخل کیا تھا اس میں جنگی اور انتظامی دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں لیکن اس کے پہنچنے سے پیشتر مغل شہزادے تمام امور اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ بادشاہ نے اگرچہ بخت خان کو پورے اختیارات دے دئے تھے لیکن شہزادوں کو کب منظور تھا کہ کوئی اور شخص دہلی میں مختار بن جائے وہ ہر کام میں روڑے اٹکاتے رہے یہاں تک کہ انتظام درست ہو ہی نہیں سکا۔

بخت خان بریلوی نے آزادیٔ وطن کا جذبہ اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا تھا اسے اپنے شہر کے واجب الاحترام قومی و دینی رہنما سید احمد شہیدؒ سے بے پناہ عقیدت تھی اور وہ بالاکوٹ میں شہید ہونے والے سرفروشوں کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کے لیے سخت بے چین تھا۔ اس نے سامراجیوں کے جنگی اسرار و رموز معلوم کرنے کی خاطر ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کی تھوڑی ہی مدت میں اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا اور جب اسے یہ خوشخبری ملی کہ دہلی میں سرفروشانِ آزادی سامراجیوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں تو وہ انگریز فوج کی ملازمت چھوڑ کر اپنے ہمخیال محبان وطن کے ہمراہ فوراً وہاں پہنچ گیا۔

بخت خان نے سامراجیوں پر ایک کاری ضرب لگانے کی پوری تیاری کی لیکن غداروں کی گہری سازشوں نے ان کے تمام منصوبے ناکام بنا دیئے۔ بہادر شاہ ظفر کا سمدھی مرزا الٰہی بخش ملکہ زینت محل اور وزیر حکیم احسن اللہ خان وغیرہ دشمن عناصر میں سب سے پیش پیش تھے۔ وطن کے ان بدترین دشمنوں نے بخت خان اور بادشاہ کے درمیان [illegible]

کرنے کے بعد انگریزوں کو دہلی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کیننگ نے ان کی ہدایت پر بلا تاخیر عمل کیا اور فوراً ہی پنجاب، بنگال اور مدراس کی فوجیں انگریز افسروں کی قیادت میں دہلی میں داخل ہوگئیں۔

بخت خان سپہ سالار نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ انگریزوں نے اگر دہلی کو فتح کر لیا ہے تو مضائقہ نہیں ہمارے لیے ہندوستان کھلا پڑا ہے۔ میرے ساتھ تشریف لے چلیے جانبازانہ جنگ کریں گے شہر لڑائیوں کے لیے مناسب مقام نہیں ہوتے اور شہر دہلی کا موقوعہ محل تو فوجی نقطے سے خاصہ خراب تھا شہر نشیب میں تھا اور انگریزی فوج پہاڑی پر اونچی جگہ پر تھی جتنی دیر بھی ہم نے مقابلہ کیا وہ بڑی ہی غیر معمولی بات تھی نیز آپ نے مرزا مغل کو سپہ سالار بنایا تھا۔ جنہیں فنون جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ باہر سے رسد لانا بھی سہل نہ تھا اگر ہم باہر نکل جائیں گے تو بہت کچھ کر سکیں گے بادشاہ، بخت خان کی تقریر سے بہت متاثر ہوا اور کہا کہ اب تو ہم ہمایوں کے مقبرے میں جاتے ہیں کل وہاں آ کر ملو گے تو آئندہ کے متعلق آخری فیصلہ کر لیا جائے گا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس مشورہ پر عمل پیرا ہونے کے بعد نتیجہ کیا برآمد ہوتا یا نہ ہوتا البتہ مشورہ ہر لحاظ سے صائب تھا۔ حریت پسندوں کے دہلی پہنچنے اور بہادر شاہ کو بادشاہ بنانے کے بعد سے اب تک کے چار مہینوں میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان کشت و خون کے جو واقعات پیش آئے تھے۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کرنا صریح ہلاکت کو دعوت دینا تھا نیز بادشاہ نے اختیاراً یا اضطراراً جس جہاد آزادی سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا اس کی عزت و آبرو کا تقاضا یہی تھا کہ وہ آخری دم تک میدان جنگ میں ثابت قدم رہتا یقیناً اس طرح دہلی کی تسخیر انگریزوں کے لیے بڑی حد تک بے معنی ہو جاتی اور ملک کی جتنی قوتیں انتظار کر رہی تھیں کہ جنگ دہلی کے نتائج دیکھ لینے کے بعد کوئی قدم اٹھائیں وہ بادشاہ کے نکلتے ہی مقابلے کے لیے میدان میں نکل آتیں۔ اور انگریزوں کے لیے اس عزم عظیم کی روک تھام سہل نہ رہتی لیکن اس اقدام کیلئے جس عزم و ہمت اور جس جانفشانی اور جانبازی کی ضرورت تھی۔ وہ بہادر شاہ میں موجود نہ تھی پھر وہ عمر کی بیاسی منزلیں طے کر رہا تھا وہ عالمگیر اعظم نہ تھا جو نوے سال کی عمر میں بھی عساکر قاہرہ کے ساتھ قلعوں یا علاقوں کی تسخیر یا سرکشوں کی سرکوبی کی غرض سے کوہ پیمائی اور دشت نوردی کے لیے مستعد رہتا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کا ماحول عزم و ہمت کے ہر کام اور ہر عمل کے لیے حد درجہ ناسازگار تھا۔

مرزا الٰہی بخش و منشی
رجب علی کی وطن دشمن
اور فرنگی نواز سرگرمیاں

مرزا الٰہی بخش کو باسورتھ سمتھ نے میجر ہڈسن کا تنخواہ دار لکھا ہے گویا انگریزوں سے اس کے خصوصی تعلق میں کلام کی گنجائش نہ تھی لیکن اس بیان سے قطع نظر کرتے ہوئے خود انگریزوں نے لکھا ہے کہ چودہ ستمبر کی انگریزی یورش کے بعد مرزا چاہتا تھا کہ انگریزوں کی کوئی بہت بڑی خدمت انجام دے کر ان کی نظروں میں اعتبار حاصل کر لے اور بادشاہ کو گرفتار کرا دینے سے بڑی خدمت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ منشی رجب علی جگراؤں ضلع لدھیانہ کا باشندہ تھا۔ حد درجہ انگریز نوازی کی بدولت مغربی آقاؤں نے ان کو ارسطو جاہ کا خطاب دیا تھا۔ ان کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں "سرکار انگریزی کا جو ایجنٹ اس مخبری کے لیے کہ دشمن کیا حرکتیں کر رہا ہے دہلی میں رہتے تھے ان سب کے سردار منشی رجب علی تھے"۔ جاسوسی کے لیے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہئیں وہ ان میں تھیں انگریز منتظموں کو ان پر پورا اعتماد تھا وہ ہمیشہ اپنے کار فرماؤں کے ساتھ راست باز رہے۔ سچی بات دریافت کرنے کی عجیب قابلیت و استعداد اور فراست و کیاست رکھتے تھے۔

مرزا الٰہی بخش کا سلسلہ ربط و ضبط اور انگریزوں سے جوڑنے کا ذریعہ منشی رجب علی ہی تھا چنانچہ بہادر شاہ کی گرفتاری نیز شہزادوں کی اسیری اور قتل میں انہی دو شخصوں کا حصہ سب سے بڑا ہوا تھا۔

بخت خان کی بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوششوں کو بے اثر بنانے کے لیے مرزا الٰہی بخش نے ترغیب و ترہیب کے کسی بھی حربے کے استعمال سے دریغ نہیں کیا اس نے بادشاہ کو کچھ اس طرح سے سمجھانا شروع کیا کہ اگر آپ سپاہ کے ساتھ چلے جائیں تو بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں گی اور سپاہیوں کی شکست بہر حال یقینی ہے اس وقت آپ انگریزوں کے سامنے کوئی عذر پیش نہیں کر سکیں گے اور باغیوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی لیکن اگر آپ اس وقت ان سے الگ ہو جائیں گے تو کہہ سکیں گے کہ آپ ساتھ دینے پر مجبور رہتے۔ کوئی وجہ نہیں کہ انگریز اس معقول عذر کو قبول نہ کریں۔ نیز باہر نکلیں گے تو پردہ نشین بیگمات، شہزادیوں اور شہزادوں کو کہاں لیے پھریں گے۔ اور آخر میں یہ بھی کہا کہ وہ آپ باغیوں کے ساتھ تشریف لے جائیں میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کرا دوں گا اور آپ پر یا آپ کی اولاد پر کوئی حرف نہ آنے دوں گا"۔ باسورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ مرزا الٰہی بخش کے رگ رگ میں غداری رچی ہوئی تھی۔ وہ ہڈسن کا تنخواہ دار تھا اور اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ بادشاہ کو بخت خان کے ساتھ نہ جانے دے بلکہ ہمایوں کے مقبرے میں روک رکھے پھر اسے ہڈسن کے حوالے کر کے اس عظیم الشان خدمت کی قیمت وصول کرے۔

بخت خان کو حالات کے آئینے میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بادشاہ اور ان کی حرم شاہی کی جانیں مقبرہ ہمایوں میں محفوظ نہیں رہ سکتیں چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ

کر بہادر شاہ ظفر کو وقت کی نزاکت سے آگاہ کرتے ہوئے یہ آخری الفاظ کہہ دئے،

"آپ بمع اہل و عیال ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں ہم کسی مناسب جگہ محاذ قائم کر کے آزادی وطن کی خاطر آخری دم تک لڑیں گے"۔ ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کے مقبرے میں مرزا الہٰی بخش اور بخت خاں نے بیک وقت بادشاہ سے گفتگو کی۔ بخت خاں ساتھ جانے پر اصرار کر رہا تھا اور مرزا روکتا تھا یہاں تک کہ بخت خان ایک موقعہ پر مرزا کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن بادشاہ نے کہا کہ مجھے آپ کی رائے پسند ہے تاہم جسم کی قوت جواب دے چکی ہے اور اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں آپ جہاد جاری رکھیں تاکہ ہندوستان کی آبرو رہ جائے۔ کمال الدین حیدر نے لکھا ہے کہ حکیم احسن اللہ خان نے بادشاہ کی طرف سے بخت خان کو یہ بتایا تھا کہ وہ بھاگنے کے لیے تیار نہیں۔ غلام رسول مہر نے قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۵۲ کے حوالے سے بتایا ہے کہ فی الحقیقت بادشاہ کو یقین واثق تھا کہ ان کے (حکیم صاحب) واسطے سے صفائی حکام سے حاصل ہو جائے گی اور معیتِ فوج میں سراسر مذلت و خرابی۔ یہاں کے ٹھہرنے میں بظاہر نا اِن خشک منصور لیکن سبز رنگوں کی خبر تھی۔ منشی رجب علی کی طرف سے بھی مرزا کو یہ تاکیدی پیغام آ گیا تھا کہ بخت خان کے چلے جانے کے بعد صرف چوبیس گھنٹے کے لیے بادشاہ کو روکے رکھئے باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجئے میں تمام انتظامات کروں گا۔

مرزا الہٰی بخش اور منشی رجب علی کی فریب آرائی سے بخت خان کو جواب مل گیا اسے بے حد قلق ہو گا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا بہادر شاہ کی قسمت میں یہی تھا کہ تاریخ کے صفحات پر خونِ مظلومیت کا ایک دھبہ بن کر رہ جائے اور یہی ہوا بادشاہ کی طرف سے نا امید ہو کر بخت خان اور اس کے جانباز ساتھی کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور بہادر شاہ کی بے تاب نگاہوں نے دیر تک ان ایسے مسافروں کا تعاقب کیا حتیٰ کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سرفروشانِ آزادی نہ صرف بہادر شاہ بلکہ تمام اہل ہندوستان کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے اور بعد کے واقعات کوئی نہیں جانتا کہ بخت خان اپنے ساتھیوں کو لے کر کہاں گیا۔ ان ایسے مسافروں پر کیا گزری اور ان کا کیا انجام ہوا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ ایسے مسافر مقبرہ ہمایوں سے نکل کر روہیلکھنڈ پہنچے وہاں انہوں نے ایک نیا محاذ قائم کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی اس کے بعد لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں یکے بعد دیگرے دو تین محاذ قائم کئے مگر ناسازگار حالات کی وجہ سے وہ اپنے مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ بالآخر بخت خان ایک معرکہ میں دادِ شجاعت دیتا ہوا شہید ہوا۔ مگر خادم مصری صاحب جذبہ آزادی میں لکھتے ہیں کہ یہ سب قیاس آرائیاں ہیں برصغیر کے بڑے بڑے مؤرخ اور محققین ان ایسے مسافروں کے بارے میں صحیح معلومات فراہم نہ کر سکے۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں کی تقسیم

(از سید عطاء الرحمٰن جعفری بی اے آنرز، سیکرٹری پارلیمانی بورڈ، جمعیت علماء اسلام)

پاکستان کی کل آبادی ــــــ چھ کروڑ پچاس لاکھ

ووٹران کی تعداد ــــــ تین کروڑ آٹھ لاکھ پچھتر ہزار نو سو اکیاون۔

خواتین ووٹرز ــــــ ایک کروڑ تیس لاکھ تیس ہزار

ووٹرز کی صوبائی تعداد

پنجاب	۱۸۹۲۸۸۹۳
سندھ	۴۸۳۲۱۲۶
سرحد	۳۷۴۶۷۷۲
بلوچستان	۱۳۹۸۱۵۵

قومی اسمبلی

قومی اسمبلی ۲۱۶ نشستوں پر مشتمل ہو گی۔ اس میں خواتین کے دس اور اقلیتوں کے لیے چھ نشستیں مختص ہوں گی۔ قومی اسمبلی کے لیے نشستوں کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

قومی اسمبلی

صوبہ سرحد	۲۶
وفاقی حکومت	۱
وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقے	۸
پنجاب	۱۱۵
سندھ	۴۳
بلوچستان	۷
خواتین	۱۰
اقلیتیں	۶
کل	۲۱۶

صوبائی اسمبلیاں

پنجاب اسمبلی

عام نشستیں	۲۴۰
خواتین	۱۲
اقلیتیں	۵
کل تعداد	۲۵۷

سندھ اسمبلی

عام نشستیں	۱۰۰
خواتین	۵
اقلیتیں	۲
کل تعداد	۱۰۷

سرحد اسمبلی

عام نشستیں	۸۰
خواتین	۴
اقلیتیں	۱
کل تعداد	۸۵

بلوچستان اسمبلی

عام نشستیں	۴۰
خواتین	۲
اقلیتیں	۱
کل تعداد	۴۳

کاغذاتِ نامزدگی واپس لینے کا طریقۂ کار

الف۔ ہر امیدوار جو نامزد ہو چکا ہو، آئینی تحریر سے خود یا اپنے تجویز کنندہ کے ذریعہ ریٹرننگ افسر کو کاغذاتِ نامزدگی کے بجے واپس لینے کی آخری تاریخ کو یا اس سے قبل درخواست کے ذریعہ اطلاع دے سکتا ہے کہ وہ انتخاب سے دستبردار ہو چکا ہے۔

ب۔ ایسی درخواست کے موصول ہونے پر اور اس پر حکم صادر فرمانے سے قبل ریٹرننگ افسر تسلی کرلے گا کہ درخواست پر امیدوار کے ہی دستخط ہیں۔ آئینی پڑتال کے بعد وہ اس کی ایک نقل نمایاں جگہ پر آویزاں کریگا۔ ناموں کی واپسی کے بعد تین روز کے اندر اندر نامزد امیدواران کے نام نوٹیفکیشن کر دیئے جائیں گے اور انہیں نشانات بھی الاٹ کر دیئے جائیں گے۔

پرچہ نامزدگی کے رد ہونے پر اپیل

جانچ پڑتال کی تاریخ کے بعد دو دن کے اندر اندر پرچہ

باقی صفحہ ۱۰ پر

پاکستان قومی اتحاد کے صدر

نمائندہ خصوصی

ایک استقبالیہ تقریب میں

خلافت اور امامت کا حق دار کون؟

برادرانِ محترم! مجھے آپ حضرات سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں نے آپ کے سامنے تقریر بھی کرنی ہے۔ مجھے صرف چائے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں سب کام چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مفتی ہونے کے باوجود ہمیں مفت چائے نہیں پلائی جاتی۔

ے قہرِ درویش بر جانِ درویش۔

مفتی صاحب کی تقریر سے قبل جناب حافظ محمدؐ یوسف صاحب نے اظہارِ سپاس کیا جو اس پروگرام کے داعی تھے۔ اس کے بعد قاری نصیر احمدؐ سیال نے قرآن حکیم کی تلاوت کی۔

تقریر کے آغاز میں مفتی صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو قاری صاحب کی تلاوت سے موضوع مل گیا ہے۔ ان آیتوں میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے خداوند قدوس سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے لوگوں کی امامت کے منصب پر فائز فرما خدا نے ان کی یہ دعا قبول فرمالی اس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم نے اپنی ذریت کے لیے بھی منصب امامت کی دعا کی۔ اللہ نے اس دعا کو قبول کرنے وقت یہ شرط عائد کر دی کہ تمہاری اولاد میں جو لوگ مفسد اور ظالم ہوں گے انہیں یہ منصب تفویض نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ پیغمبر کی اولاد ہی کیوں نہ ہوں۔

معلوم ہوا کہ امامت اور خلافت کے لیے تقویٰ، طہارت اور عدل و انصاف شرط ہے، اگر کسی شخص میں یہ اعلیٰ صفات نہیں ہیں تو وہ امامت کا حق دار نہیں۔ امامت اتنا بڑا منصب ہے جو نا اہلوں کے سپرد نہیں جا سکتا

برادرانِ محترم دوستو! پاکستان جن مقاصد کے لیے معرضِ وجود میں آیا تھا وہ آپ کو یاد ہیں۔ لیکن اس کے بعد تیس سال تک کیا ہوتا رہا، پاکستان بننے کے بعد آج تک یہاں مستحکم حکومت قائم نہیں ہوئی اور کوئی آدمی امامت اور خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے لائق نہیں آیا۔ عوام کے ساتھ ظلم و ستم اور زیادتیاں کی جاتی رہیں پاکستان کے عظیم مقصد کو فوت کر دیا گیا۔

خلافت کے لغوی معنیٰ ہیں کسی دوسری ذات کا نائب ہونا، اسلام نے اپنے حکمران کو نائب کہا ہے، خود حکمرانی مسلمان کے لیے نہیں ہے۔ مسلمان کے لیے نیابت ہے، حکومت افراد کی ہوگی لیکن حاکمِ حقیقی خدا کی ذات ہے نائب کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اپنا حکم نافذ نہ کرے اگر ایسا کرے گا تو وہ خدا کا نائب نہیں رہے گا۔ غیر مسلم حکمران اپنا حکم چلا سکتا ہے۔ مگر مسلمان حکمران کو یہ اجازت نہیں ہے، مسلمان صرف خدائی احکامات نافذ کر سکتا ہے، ہمارے ملک میں انسانوں کی حکمرانی چلتی رہی جو سراسر اسلام میں ناجائز ہے۔ اس ملک کو آج تک اسلامی حکمران نصیب نہیں ہوا اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے۔

محترم ساتھیو! حضرت آدمؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں سے یہ فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں، اس خدمت کے لیے فرشتوں نے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کیا اور اپنی ترجیح آدم پر ثابت کرنا چاہی اور جیسا کہ طریقہ ہے کہ جب دو امیدوار مقابلے میں ہوں تو ایک دوسرے کے خلاف دو باتیں ہوتی ہیں۔ پہلی بات اپنی موزونیت اور دوسری بات اپنے مخالف کی نا اہلی۔ اس اصول کے تحت فرشتوں نے جناب باری میں عرض کی کہ کیا خون ریزی اور فساد کرنے والا بھی خلیفہ بن سکتا ہے؟

فرشتوں کی جانب سے حضرت آدم کی نا اہلی پر یہ دلیل دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا اہل ہونا ثابت کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہر وقت آپ کی تسبیح تہلیل کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ کے ادنیٰ حکم کی بھی نافرمانی نہیں کرتے۔

لیکن ان دلائل کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے مشورے کو نہیں مانا، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں کہ خلافت کی صلاحیت کیا ہے؟

اصل میں انسان کی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ کہ وہ خدا کے احکام کو نافذ کرے اور دوسری یہ کہ وہ خود اپنے احکام نافذ کرے فرشتوں نے انسان پر بحیثیت انسانی کے نظر ڈالی جب کہ خداوند قدوس لفظ خلیفہ کی حیثیت انہیں بتا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میرے نائب بن کر احکام بھی میرے نافذ کریں گے،

آج پوری دنیا کو دیکھیں سرمایہ دار ممالک پر نظر ڈالیں، کمیونسٹ ممالک کو دیکھیں انسان خود حاکمِ اعلیٰ بنا ہوا ہے اور اس وجہ سے پوری دنیا فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے تخفیف اسلحہ کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں اور مسترد ہو جاتی ہیں، اسلحہ بذاتِ خود کار آمد چیز ہے لیکن اسے تعمیری مقاصد کی بجائے

تخریبی مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جانا رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو پاکستان ہم نے اسلام کے لیے بنایا تھا۔ اس میں آج تک ہم نے خدا کا قانون نافذ نہیں کیا اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نافذ کئے جاتے رہے، صحیح معنوں میں پاکستان اس وقت قائم ہوگا جب انسان خدا کا نائب بنے گا۔ اور اس ملک میں خدائی احکامات نافذ کرے گا۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ روئے زمین پر خدا کا نظام نافذ ہو پھر دیکھیں کیسے پوری دنیا میں امن قائم ہوتا ہے اسلام میں سب کے حقوق ہیں۔ اسلام نے ہمیشہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی ہے، خواہ کسی کا حق ہو، اسلام نے یہ نہیں کہا کہ حقوق طلب کرو، وہ تو جب ہو کہ کسی کو کسی کا حق غصب کرنے کا حق ہو، اسلام ایسا معاشرہ بناتا ہے کہ طلب حق کی ضرورت پیش نہ آئے، اگر ہر مسلمان دوسروں کے حقوق غصب کرنا چھوڑ دیں تو عدالتوں اور وکیلوں کی بھی ضرورت نہیں ہوگی اس پر وکلاء نے کہا ہم تیار ہیں۔

ہمیں کم از کم محنت کر کے ایسا معاشرہ قائم کرنا ہوگا کہ دنیا میں بھی جنت ہو۔ ایک آدمی اطمینان سے سو سکے ایک عورت اگر اکیلے چلے تو اس کی عزت محفوظ ہو۔

یہ کرسی، یہ اقتدار، یہ کیا چیزیں ہیں ہٹلو کے عاشق چلے قافلہ در قافلہ چلے آرہے ہیں، ان لوگوں کے سامنے بلند مقاصد نہیں ہیں، اگر یہ لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے تو ہم کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے، میں نے بار روم میں کہا تھا کہ ہر ضلع میں پانچ دس گھرانے ہر آنے والے کی پوجا کرتے ہیں، یہ لوگ سورج مکھی کے پھول کی طرح ہیں، یہ اقتدار کے سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن وزیر سے کسی نے پوچھا آپ پارٹیاں بہت تبدیل کرتے ہو، اس نے کہا میں ہمیشہ اقتدار پارٹی میں رہا ہوں، اقتدار بدل جاتا ہے اور میں اپنی جگہ قائم رہتا ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر دو تین سو ظالم وڈیروں کو سیاسی طور پر مار دیا جائے اور دریائے سندھ میں ڈبو دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اقتدار مجھے بھی حاصل ہوا تھا لیکن میں نے حصول اقتدار سے قبل ہی یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر اقتدار میرے عظیم مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوا تو اقتدار کو خیر باد کہہ دوں گا جب میں نے محسوس کیا کہ اقتدار اصولوں سے ٹکرا رہا ہے تو میں نے فوراً اقتدار کو چھوڑ دیا۔

اقتدار کے پجاری میرے نزدیک انسان نہیں ہیں میں انہیں حیوان کہتا ہوں، ہمیں اچھا معاشرہ قائم کرنا ہیں آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں میں آپ تمام حضرات اور جناب حافظ محمد یوسف صاحب ایڈووکیٹ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے دعوت دی اور میرے خیالات کو سنا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو صراط مستقیم پر چلائے۔ (آمین)

شاہدرہ لاہور

قیام لاہور کے دوران قائد جمعیت و قائد قومی اتحاد مولانا مفتی محمود کی بے پناہ مصروفیات رہیں۔ آپ ملک شبیر محمد صاحب نائب امیر جمعیت لاہور کی درخواست پر شاہدرہ تشریف لے گئے حضرت مولانا محمد اجمل صاحب بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اس سے قبل آپ ان شہداء کے گھروں پر گئے جو تحریک نظام مصطفیٰ کے سلسلے میں انارکلی لاہور میں شہید ہوئے تھے۔ جلال الدین اکبر شہید اور حافظ آفتاب عالم شہید کے والدین اور اقارب سے تعزیت کی اور ان شہداء کے لیے بلندی درجات کی دعا فرمائی۔ شاہدرہ پہنچتے پہنچتے وقت بہت ہو گیا تھا اس لیے صرف دعا پر اکتفا کیا گیا اور حضرت مولانا محمد اجمل صاحب نے سامعین سے معذرت کی بیان سے فراغت کے بعد حضرت مولانا حامد میاں صاحب کی درخواست پر آپ جامعہ مدنیہ تشریف لائے یہاں بھی طلباء اور کارکنوں نے آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ مختصر قیام کے بعد مبارک مسجد خطبۂ جمعہ کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں کا عالم دیدنی تھا۔ ہزاروں افراد مفتی صاحب کی گاڑی کو دیکھ کر از خود رفتہ ہو گئے۔ اور ہر طرف سے نعرہ تکبیر، جیوے جیوے مفتی جیوے کی صدائیں گونجنے لگیں۔ مسجد تک جانے کے لیے بڑی دشواری پیش آئی۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اُمڈا چلا آرہا تھا۔

اس موقع پر کی گئی تقریر گذشتہ شمارے میں پیش کی جا چکی ہے۔

بقیہ نشستوں کی تقسیم

نامزدگی کے ردّ ہونے کے خلاف اپیل کی جا سکتی ہے۔

یہ اپیل الیکشن کمیشن کو پیش کی جائے گی اور سیکرٹری الیکشن کمیشن یا متعلقہ صوبائی الیکشن کمشنر کے ذریعہ پیش کی جا سکتی ہے۔

۲۔ اپیل امیدوار خود بھی داخل کر سکتا ہے یا اپنے نمائندہ کے ذریعہ دائر کر سکتا ہے۔ اپنا نمائندہ وہ تحریری طور پر اپنے دستخطوں سے مقرر کر سکتا ہے۔

۳۔ اپیل ایک یادداشت کی صورت میں ہوگی۔ جس میں پرچۂ نامزدگی کے ردّ کرنے کی وجوہات کے خلاف دلائل اور ردّ کرنے کی تاریخ سے آگاہ کیا جائیگا۔

۴۔ اپیل کے ساتھ متعلقہ ریٹرننگ افسر کے حکم کی مصدقہ نقل بھی شامل کیا جائے۔

۵۔ اپیل کی سماعت کے وقت اور دن کا تعین ریٹرننگ افسر کرے گا اور اس کا اعلان ریڈیو اور پریس کے ذریعہ بھی کر دیا جائے گا۔

۶۔ اپیل کے منظور ہونے پر اپیل دہندہ امیدوار کا نام امیدواروں کی مصدقہ فہرست میں داخل کر دیا جائے گا۔

مشاہیرِ اسلام

عبد الصمد صارم

مشفق استاذ فاضل اجل مولانا رسول خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

استاد مشفق، استاذ الاساتذہ، امام منطق فاضل اجل، علامۂ دہر حضرت مولانا غلام رسول خان صاحب کی تعریف و توصیف سے میرا قلم عاجز ہے۔ ایسی جامع ہستیاں کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود وہ مجھ سے اس طرح ملا کرتے تھے جیسے میں ان کا استاد ہوں۔ اور وہ، میرے شاگرد ہیں۔ ان کا یہ وصف ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گا۔ میں ان کا ایک ادنیٰ شاگرد اور ماتحت تھا مگر وہ میری اس قدر تعظیم کیا کرتے تھے کہ مجھے شرم آتی۔ آخر ایک دن مجبور ہو کر میں نے عرض کر ہی دیا کہ آپ اس قدر میری تعظیم نہ فرمایا کریں۔ مگر کئی دفعہ ٹوکنے پر بھی وہ نہ رکے۔

یوں تو ہمارے سارے اساتذہ دیوبند بے حد منکسر المزاج تھے مگر جو بات مرحوم میں دیکھی کسی میں نہ پائی۔

میں نے ان سے کئی بار کہا۔ میں آپ سے عمر، عہدے اور علم میں بے حد چھوٹا ہوں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ آپ کو میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہئے۔ مگر وہ سنی ان سنی برابر کر دیتے تھے۔

جب تک وہ کالج میں رہے مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ میرا ایک مشفق باپ، میرا پشت پناہ کالج کے احاطہ میں موجود ہے۔ میرا ایک مخلص دوست ایک دانا ناصح ہر وقت میرے ساتھ ہے جب وہ کالج سے تشریف لے گئے، تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔

چونکہ وہ میرے استاد تھے، لہٰذا جہاں کسی کتاب میں کوئی کتاب سمجھ میں نہ آتی، ہم زحمتِ مطالعہ نہ اٹھاتے ان کے پاس چلے جاتے اور وہ بڑی محبت سے سمجھا دیتے۔ میں یہ خیال کرتا کہ کہیں میں ان کی نظروں سے گر تو نہیں گیا۔ بارہا اچھی طرح انہیں ٹٹول کر دیکھا تو یہی محسوس کیا کہ میں سوال کرنے سے ان کی نظروں میں اور زیادہ معظم و مکرم ہو گیا ہوں۔

ایک دفعہ میں کالج کے طالب علموں کے سامنے کچھ دریافت کرنے لگا تو انہوں نے لڑکوں کو کسی بہانے سے باہر بھیج دیا اور مجھ سے فرمایا۔

"لڑکوں کے سامنے دریافت نہ کیا کرو۔"

میں کبھی اس قسم کی غلطی کرتا تو وہ تنہائی میں مجھے سمجھا دیتے۔

استاد مرحوم کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد یہ آرام جاتا رہا ہے کہ اگر کسی عبارت کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے یا کسی مسئلے کے بارے میں دل کو پوری طرح تشفی نہیں ہوتی تو وہ کمی اسی طرح باقی رہ جاتی ہے۔

مجھے اس بات کا بڑا ہی دکھ ہے۔ کہ اب میں کس کے سامنے دستِ سوال دراز کروں؟

جب تک حضرت صاحب دار العلوم دیوبند میں رہے۔ ان کے متعلق یہ بات مشہور رہی کہ وہ گوشہ نشین انسان ہیں۔ کسی سے ملتے ملاتے نہیں جیسے دوسرے اساتذہ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ وہ کسی سے ملتے جلتے نہ تھے۔ اپنا سبق پڑھایا اور گھر کی راہ لی۔ کالج کی زندگی میں بھی ان کا یہی دستور رہا۔ وہ اسٹاف روم میں بہت کم بیٹھتے تھے۔ بس اپنی درس گاہ میں تشریف فرما رہتے تھے۔ درس گاہ سے مکان تشریف لے جاتے اور عام طور سے کالج کے جلسوں وغیرہ میں کم ہی شرکت کرتے۔

تقسیم ملک سے پیشتر کالج میں پنڈت اور سکھ پروفیسر بھی تھے میں نے دیکھا کہ وہ ان کے ساتھ بالکل غیر متعصبانہ طور پہ ملتے تھے۔ اور بڑے اخلاق سے پیش آتے تھے۔ سارا سٹاف ان کی بزرگی اور خوش خلقی کا معترف تھا۔

انہوں نے کبھی کسی پارٹی میں حصہ نہیں لیا۔ نہ کسی پارٹی کی مخالفت کی۔ بس انہیں تو پڑھنے پڑھانے سے لگاؤ تھا۔ کالج کی سیاست سے کوئی

جب تک حضرت صاحب دارالعلوم دیوبند میں رہے تو انکے متعلق یہ بات مشہور رہی

دلچسپی نہ تھی۔ مسلمان اساتذہ اور طالب علم تو ان کا احترام کرتے ہی تھے ہندو اساتذہ اور طالب علم بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

کالج کے علاوہ پوری یونیورسٹی کے دفتر والے خواہ وہ رجسٹرار ہوں، یا وائس چانسلر، سب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

حضرت صاحب کو کالج میں آنے سے جو سب سے بڑی تکلیف پہنچی، وہ یہ تھی کہ یہاں تشنگانِ علوم نہیں ہیں۔ کالجوں کی زندگی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کہ طالب علم معمولی طور سے لکھتے پڑھتے ہیں کہ سند مل جائے۔ دارالعلوم دیوبند جیسے عاشقانِ علوم یہاں کہاں۔ پھر بھی ان کی شہرت کو سن کر خدا کے فضل سے دو چار وارفتگانِ علم کالج میں صرف انہی کی وجہ سے داخل ہوتے تھے۔ اور ان کی وجہ سے حضرت صاحب کا دل لگا رہتا تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ بس بیٹھا ہوا پڑھاتا رہوں۔ کیا پیریڈ اور کیا وقت؟

وہ کالج میں مولوی فاضل کلاس کے ہیڈ مولوی تھے۔ یہاں منطق میں۔۔۔ سلم العلوم اور فلسفہ میں شمس بازغہ داخل کورس رہا ہے۔ یہ دونوں کتابیں وہ بڑے شوق سے پڑھاتے تھے اور بعض لوگ صرف انہی کتابوں کے پڑھنے کی وجہ سے کالج میں داخلہ لیتے تھے۔ اور ترمذی شریف بھی ہمیشہ ان کے پاس رہی۔ کچھ دنوں بیضاوی بھی پڑھائی۔

میں نے یہ دیکھا کہ حضرت صاحب "صدقۂ سر" جاری رکھتے تھے۔ ہر سال وہ مجھے کچھ روپے دیتے کہ میں غریب طالب علموں کی فیسیں جمع کرا دوں، کبھی کتابوں کے لئے دام دیتے کہ میں غریب طلبہ کو کتابیں خرید دوں اور کبھی کوئی کتاب میرے سپرد کر دیتے کہ فلاں طالب علم کو دے دینا۔ اس کے پاس کتاب نہیں ہے۔ کبھی فیس امتحان اپنی جیب سے دیتے اور کبھی کسی دوست سے امداد کرا دیتے۔ ان کے اس عمل کا یہ اثر ہوا کہ مجھے بھی طلبہ کی امداد کا خیال پیدا ہوا۔ اور میں نے دوسرے اساتذہ کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔

اگر کوئی طالب علم فیل ہو جاتا، تو انہیں ایسا ملال ہوتا کہ جیسے ان کا اپنا فرزند فیل ہو گیا ہو۔ ہمیشہ ان کی یہ کوشش رہتی کہ ایک طالب علم بھی فیل نہ ہونے پائے۔

مرحوم وقت کے اس قدر پابند تھے کہ ہمیشہ کلاس میں اپنے وقت سے پہلے موجود ہوتے۔ سب سے پہلے ان کا پیریڈ ہوتا تھا۔ خواہ کتنی ہی سردی اور بارش ہوتی، وہ باوجود ضعیف العمری کے سارے استادوں سے پہلے آتے اور اپنا پیریڈ چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ دوسرے استادوں کا پیریڈ بھی لینا چاہتے تھے۔ درس سے اٹھنے کو ان کا جی ہی نہ چاہتا، جبکہ دوسرے پروفیسر اس تاک میں رہتے ہیں کہ کسی طرح پیریڈ سے خلاصی ہو۔

ایک بات پر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی۔ میں ان کے نوعمر شاگردوں میں سے تھا اور وہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے مگر وہ مسلسل تین گھنٹے تک پڑھاتے رہتے تھے اور ہمارا یہ عالم تھا کہ آدھ گھنٹہ بولنے کے بعد طاقتِ گفتار ہی ختم ہو جاتی تھی۔ پھر وہ اتنی بلند آواز سے پڑھاتے کہ اگر ہم لوگ اتنی بلند آواز سے بولیں اور مسلسل تین گھنٹے بولیں تو ہارٹ ہی فیل ہو جائے۔ میں اسے ان کی کرامت سمجھتا ہوں۔

اب زندگی کے آخری دنوں میں جی چاہا کہ ان کے درس میں شریک ہوں تو جامعہ اشرفیہ چلا گیا۔ حضرت صاحب حدیث کا درس دے رہے تھے۔ میں خاموشی سے سبق کے آخر میں جا بیٹھا۔ ان کی جو نظر پڑی، تو فوراً مجھے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ میں اگلی صف میں بیٹھ گیا مگر انہوں نے باصرار اپنے پاس ہی بٹھایا۔ اس زمانے میں بھی میں

میں نے یہ دیکھا کہ حضرت صاحب "صدقۂ سر" جاری رکھتے تھے!

نے دیکھا کہ وہ بڑی بلند آواز سے پڑھا رہے ہیں۔ تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ صد سالہ بوڑھا بھی اسطرح بول سکتا ہے۔

مجھے ان سے شمس بازغہ کا کوئی مسئلہ حل کرنا تھا تو انہوں نے اپنی بیٹھک سے سب کو رخصت کرا دیا اور کمرہ بند کرا دیا میں نے دل میں کہا۔

"دیکھو انہیں ہماری پوزیشن کا کتنا خیال ہے جبکہ ہم خود اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ لوگوں کے سامنے ان کے آگے کتاب کھول کر بیٹھیں۔ آخر شاگرد جو ٹھیرے۔"

ان کا نظام بڑا خراب ہے۔ نہ تنخواہ وقت پر ملتی ہے نہ پوری ملتی ہے۔ کبھی آدھی مل گئی کبھی چوتھائی۔ پھر ان میں بڑی سخت پارٹی بازی ہوتی ہے۔ اور مہتمم مدرسہ کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے۔ یہ لوگ بڑی آسانی سے جواب دے دیتے ہیں۔ یونیورسٹی میں کسی ایک آدمی کے ہاتھوں میں پورے اختیارات نہیں ہیں۔ اگر پرنسپل یا وائس چانسلر بھی نکالنا چاہے تو آسانی سے کسی کو نہیں نکال سکتا۔"

کالج کا ایک پروفیسر مولانا کے

ان سے ہزاروں مستفید ہوتے۔ نفع اور یہاں صرف دس پانچ، وہ بھی معمولی قابلیت کے حامل، پھر یہ کہ یونیورسٹی کا طرز تعلیم اور ہی قسم کا ہوتا ہے کالجوں میں تو یونہی سرسری سی تعلیم ہوتی ہے وہ بحث ومباحثہ یہاں کہاں۔ اساتذہ کا وہاں مجمع تھا۔ یہاں کہاں۔ اور جو ماحول دارالعلوم دیوبند کا تھا، وہ مذہبی دینی، علمی اور متقیانہ ماحول یہاں کہاں؟

وہ پروفیسروں کے درمیان، بیٹھے ہوئے مجھے کچھ اچھے معلوم نہ ہوتے

حضرت صاحب مجھ سے کوئی بات چھپاتے تھے

حضرت صاحب مجھ سے کوئی بات چھپاتے نہ تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند سے اس لئے رخصت ہوئے کہ ارباب انتظام سے خوش نہ تھے۔

جامعہ اشرفیہ سے بھی وہ خوش نہیں رہے، فرمایا کرتے تھے۔

"مولوی ادریس میرا شاگرد رہا ہے اسے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین بنا رکھا ہے۔"

مفتی محمد حسن صاحب کے ویسے وہ بہت مداح تھے، فرمایا کرتے تھے۔

"مفتی اس طرح خرچ کرتا ہے کہ تہی دستی کی پرواہ نہیں کرتا۔"

میں نے کہا۔

"مجھے بھی جامعہ اشرفیہ میں بلا لیجئے بلا سے اتنی تنخواہ نہ سہی۔ مگر میں چاہتا ہوں مجھ سے تشنگانِ ادب سیراب ہوں۔ کالج میں تو طالب علم آتے ہی نہیں۔"

فرمانے لگے۔

"کبھی بھی مدارسِ نظامیہ کا رخ نہ کرنا

علم و مرتبہ سے بہت جلتا تھا مولانا اس سے اس لئے ناراض تھے کہ وہ پڑھنے پڑھانے میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ ان کے اعتراض کرنے کی وجہ سے آپس میں اچھی خاصی لگتی تھی میں یہ سمجھتا تھا کہ مولانا اس کے بدخواہ ہوں گے کیونکہ وہ ان کی تعظیم نہیں کرتا مگر میں ایک دن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جیسا میں خیال کرتا تھا اس کے برعکس مولانا کا دل بالکل صاف تھا اور وہ اسے فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ جیسے کوئی مخلص دوست کا بھی خواہ ہوتا ہے۔

جب میں کالج میں داخل ہوا تو حضرت صاحب کو دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ دارالعلوم دیوبند میں جس طرح پروانہ وار طالب علم ان پر قربان ہوتے تھے، یہاں یہ بات نہ تھی۔ دارالعلوم میں تو ان کے پیچھے پیچھے چالیس پچاس طالب علموں سے کم نہ ہوتے تھے۔ طالب علم بھی ایسے جو خود بڑے پائے کے عالم ہوتے تھے، وہاں

تھے۔ کہاں یہ بے سواد لوگ اور کہاں یہ پاکیزہ ہستی۔ نہ کالج کے طالبعلموں کو پڑھاتے اچھے لگتے تھے۔ کہاں وہ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم اور کہاں یہ طالب اسناد۔ جو لوگ کالجوں کا رُخ کرتے ہیں۔ وہ صرف طالب اسناد ہوتے ہیں۔ علم کے طالب نہیں الا ماشاء اللہ۔

جب وہ جامعہ اشرفیہ تشریف لے گئے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اب وہ پھر اپنے صحیح مقام پر مسند نشین ہو گئے ہیں۔ گو میری تو یہی تمنا رہی کہ کاش! وہ دارالعلوم دیوبند چلے جاتے اور در اصل ایسا ہی ہوتا مگر تقسیم ملک کے بعد یہ بات کچھ ممکن سی نہ رہی تھی۔

دارالعلوم دیوبند میں ان کا "بزاخفش" مشہور تھا۔ عام طور پر وہ سوالات کرنے والوں کو "بزاخفش" کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ کالج میں ان کی زبان سے یہ لفظ کبھی نہیں سُنا۔ کیونکہ یہاں کا ماحول اور ہی قسم کا تھا۔

یہاں استادوں کا وہ احترام کہاں ؟

البتہ "امکان تو ہے" اور "احتمال تو ہے" یہ الفاظ دیوبند کی طرح یہاں بھی ان کی زبانِ مبارک سے نکل جایا کرتے تھے۔ وہ موقعہ بموقعہ فرما دیتے،

"مگر اس بات کا احتمال تو ہے۔ امکان تو ہے"

تو پروفیسر لوگ ہنسنے لگتے کہ مولانا پر منطق کا کس قدر غلبہ ہے ہر بات میں فرما دیتے ہیں کہ اس کا احتمال تو ہے۔ اور امکان تو ہے۔

تو میں نے دل میں کہا۔

"میں پڑھنے لکھنے والا آدمی، مجھے کھیلوں سے کیا غرض۔ میں تو نہیں جاؤں گا"

مگر حضرت صاحب کی شفقت دیکھیئے مجھے بلایا اور کہا۔

"کل یونیورسٹی گراؤنڈ ضرور پہنچنا"۔

میں نے کہا۔

"میں تو نہیں جاؤں گا"

فرمانے لگے۔

شاعر نے بے دینی کی باتیں کی ہیں، اور فلاں نے صوفیانہ شاعری کی ہے مگر اس کی شاعری اچھی نہیں۔ تو حضرت صاحب فرماتے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کی شاعری مذہب سے خارج ہو، وہ بڑا شاعر ہو۔ بڑا تو وہ ہے، جس نے دین کے دائرے میں رہ کر شاعری کی ہو"

تو اردو کے پروفیسر سن کر خاموش ہو جاتے۔

ایک دفعہ ایک صاحب بحث کرنے

جب میں کالج میں ملازم ہوا تو حضرت صاحب کو دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا

یہاں کی دنیا دارالعلوم کی دنیا سے بالکل مختلف تھی۔ جب وہ بھولے پن سے کوئی بات فرما دیتے تو پروفیسر حضرات تعجب کرتے کہ یہ کتنی معصوم ہستی ہے۔

میں بھی اس ماحول میں پلا بڑھا تھا جس میں حضرت صاحب نے زندگی گزاری تھی۔ جب میں شروع شروع کالج میں آیا تو وہ مجھے ہر اونچ نیچ سے باخبر کر دیتے تھے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ انہیں میرا کس قدر خیال رہتا ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہیں اس سے ذرا سی بھی لغزش نہ ہو جائے۔

کالج کے سالانہ کھیل یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہوتے ہیں۔ اور اس دن کالج بند رہتا ہے۔ سب طالب علم اور استاد وہاں حاضر رہتے ہیں پہلی بار میرے پاس بھی حکم آیا کہ،

"یونیورسٹی گراؤنڈ میں پہنچو"

"یہاں کی نسبت سے وہاں کی حاضری زیادہ ضروری ہے۔ تم ضرور جانا، ورنہ تمہارے خلاف ایکشن لے لیا جائے گا"۔

تب مجھے اس بات کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ورنہ گرفت میں آجاتا۔

ان کی ایسی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا استاد نہیں "پدرِ مشفق" جہاں سے اٹھ گیا ہے۔ پھر وہ اس خوب صورتی سے مجھے سمجھاتے کہ مجھے احساسِ کمتری نہ ہوتا فرماتے،

"میں جو عرض کر رہا ہوں"

انسان جس ماحول میں پلتا بڑھتا ہے۔ اس کا اثر ہر وقت اس کے دماغ پر رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسٹاف روم میں اردو کے پروفیسر اردو کے ادیبوں، اور شاعروں کا ذکر کرتے اور یہ کہتے۔ کہ فلاں

لگے کہ، ادب علیحدہ چیز ہے، اور دین اور مذہب علیحدہ بات ہے۔ اس کا اس سے کیا تعلق ؟۔

تو حضرت صاحب انہیں سمجھانے لگے۔ میں نے اس پروفیسر کو اشارہ کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

کچھ اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں کہ وہ مجھے اس ماحول کے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے اور ان کو یہ جگہ زیب نہیں دیتی تھی۔

لاہور آتے ہی انہیں دو ایسے شاگردِ رشید مل گئے تھے جن سے ان کا دل لگا ہوا تھا۔ اور یہ دونوں ان کی بڑی خدمت کرتے تھے۔ ان کی ہر بات کا خیال رکھتے۔ اور بڑی پابندی سے سبق پڑھنے آتے۔ یہ دونوں شاید بارہ چودہ سال تک ان سے درسِ نظامی پڑھتے رہے۔ ایک تو خان بہادر چوہدری محمد حسین،

باقی صفحہ ۱۷ پر



سیٹو مرحوم

مختصر حالاتِ زندگی!

اس سال جون کے اواخر میں چچا سام کے پیارے سیٹو (SEATO) کا خاتمہ ہو گیا۔ سیٹو ۱۹۵۴ء میں ایک امریکی وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس کی ذہنی اور سفارتی کاوشوں کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ اس فوجی بلاک سے پاکستان ۱۹۷۲ء تک وابستہ رہا۔ اور ۱۹۷۲ء میں جب پاکستان مشرقی بازو کے بنگلہ دیش بن جانے کی وجہ سے جنوب مشرقی ایشیا کی جغرافیائی سیاست میں اپنی اہمیت کھو بیٹھا تو اسے اس بلاک سے رخصت کر دیا گیا۔ تاہم مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس بلاک سے پاکستان کو نکال دیا۔ اب اس خرخشے میں کون پڑے کہ سیٹو نے پاکستان کو نکال دیا تھا یا بھٹو نے؟ —— تاہم قارئین کی سہولت کے لئے یہ عرض کرتا چلوں کہ مسٹر بھٹو نے بحیثیت سربراہ مملکت پاکستان کا اقتدار سنبھالنے کے بعد سنٹو (CENTO) میں، پاکستان کی دو بے عملی ختم کر دی جو ایوب خان کے دور میں شروع ہوئی تھی۔ اور، از سرِ نو پاکستان سنٹو میں اور اس کی سیاسی اور فوجی سرگرمیوں اور اجلاسوں میں سرگرم نظر آنے لگا۔

سیٹو نے اپنے وجود کے ۲۳ سالوں میں جنوب مشرقی ایشیا کے واقعات اور حالات میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس علاقے کی کشیدہ صورتِ حال اسی فوجی بلاک کے مرہونِ منت تھی۔ اس بلاک کے قیام کے دوسرے سال ہی انڈونیشیا کے خلاف مسلح اشتعال انگیزیاں شروع کی گئیں۔ جو اس وقت ڈاکٹر عبدالرحیم سوئیکارنو کی قیادت میں مغربی طاقتوں کے دباؤ اور —— بلیک میلنگ کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ویت نام، لاؤس اور کمبوڈیا کی جنگوں میں بھی اس بلاک نے سرگرم کردار ادا کیا۔ اس بلاک کے ممبر بعض جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں کی فوجوں نے ویت نام میں امریکی مفادات کے لئے جنگ کی۔ سیٹو کے ان رکن ملکوں میں جنہوں نے ویت نام کی جنگ میں براہ راست حصہ لیا۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فلپائن اور تھائی لینڈ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ویت نام، لاؤس اور، کمبوڈیا کی جنگوں کے دوران سیٹو کے تحت جنوب مشرقی ایشیا میں قائم امریکی اڈوں سے امریکی فوجوں کو کمک ملتی تھی یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں موجود امریکی بیڑے کے طیارہ بردار ایٹمی جہاز بحر ہند میں اکثر گشت کرتے رہتے ہیں۔ اور بحر ہند کے ملکوں میں جب کبھی کوئی بحران یا پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو امریکی ساتواں بحری بیڑہ فوراً ہی متعلقہ ملک کے ساحل پہ پہنچ جاتا ہے۔

گو کہ سیٹو کا خاتمہ فوجی و سیاسی بلاک سازی کی امریکی پالیسی کے دیوالیہ پن کا ایک اور ثبوت ہے۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ علاقے میں کسی نئے جنگی بلاک کے قیام سے امریکہ باز آئے گا۔

ہمارے اس خیال کو سیٹو کے ممبر ملکوں کے اس اعلان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اس بلاک کے خاتمے کے باوجود ۱۹۵۴ء کا وہ منیلا چارٹر ابھی تک قائم ہے جو اس بلاک کے قیام کے وقت جاری کیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ امریکی وزیر خارجہ سائرس وانس کا یہ بیان کہ ——

"ایشیا میں امریکی مفادات دیرپا اور اہم ہیں۔ اور امریکہ اب بھی بحرالکاہل اور ایشیا کی ایک بڑی طاقت ہے۔ ہم اس علاقے میں اپنی مضبوط فوجی موجودگی برقرار رکھیں گے"۔

گو کہ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ مستقبل میں امریکہ بحرالکاہل اور جنوب مشرقی ایشیا میں اپنی فوجی موجودگی کے لئے جاپان، امریکی دفاعی معاہدے اور چینی تعاون کا سہارا لے گا۔ جس کی طرف سابق صدر فورڈ نے چین اور جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں کے دورے کے بعد امریکہ واپس پہنچ کر اپنے ایک پالیسی بیان میں "جدید الکاہلی نظریے" کی صورت میں اشارہ

لیا تھا۔

اس وقت بعض مبصرین نے خیال ظاہر کیا تھا کہ صدر فورڈ کے اس پالیسی بیان کو جاپان کی طرح چین کی بھی حمایت حاصل ہے۔ اس لئے ویت نام کی جنگ کے دوران بھی اور اس جنگ کے خاتمے کے بعد بھی متعدد بار چینی رہنماؤں نے جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی فوجی موجودگی کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اور تھائی لینڈ سے امریکی فوجی اڈوں کے خاتمے کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔ اس کے علاوہ افریقہ اور لاطینی امریکہ میں عوامی جمہوریہ چین اور امریکہ کے درمیان موجود، سیاسی، سفارتی اور فوجی تعاون کو بھی مبصرین ایک مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں بھی چین، امریکی فوجی و سیاسی اشتراک عمل ہو گا۔

عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ امریکہ کا فوجی و سیاسی تعاون خواہ کتنا گہرا اور مستحکم کیوں نہ ہو، اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے کہ امریکہ علاقے میں سیٹو کا کوئی متبادل نہیں ڈھونڈے گا۔ اوّل تو اس لئے کہ چین کے جنوب مشرقی ایشیا میں جو عزائم ہیں وہ آئندہ کسی بھی وقت امریکہ سے متصادم ہو سکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ امریکہ کے ساتھ چین کا موجودہ تعاون اور اشتراک عمل ایک تدبیراتی حربہ ہے نہ کہ حکمت عملی کا کوئی جزو۔ اس لئے فوری امکان یہی ہے کہ امریکہ ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایسٹ ایشین نیشنز (ASEAN) کو سیٹو کے متبادل کے طور پر استعمال کرے گا۔ اس تنظیم میں، انڈونیشیا، ملائشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور فلپائن جیسے ملک شامل ہیں۔ اور اس تنظیم نے جو آج سے دس سال قبل رکن ملکوں کے درمیان معاشی اور تہذیبی تعاون کو فروغ دینے کی غرض سے قائم ہوئی تھی۔ کافی فاصلہ طے کیا ہے۔ اس کے بعض ممبر ملکوں نے مثلاً تھائی لینڈ اور ملائشیا اور ملائشیا اور انڈونیشیا نے فوجی معاہدے کر رکھے ہیں۔ اور انہی معاہدوں کے تحت وہ مشترکہ طور پر داخلی مخالفین کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں۔ جس کی ایک مثال تھائی لینڈ اور ملائشیا کی جانب سے، "کیمونسٹ باغیوں" کے خلاف مشترکہ فوجی کارروائی سے بھی ملتی ہے۔

اس کے علاوہ انزس (ANZUS) امریکہ، نیوزی لینڈ، اور آسٹریلیا کے فوجی معاہدے کے اراکین آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ جنوب مشرقی ایشیائی اقوام کی تنظیم (ASEAN) کے رکن ملکوں کے فوجی تعلقات بھی قائم ہیں۔ اور انہی تعلقات کے تحت گزشتہ دنوں آسٹریلیا اور انڈونیشیا کے درمیان مشترکہ فوجی مشقیں بھی ہوئیں جس کی ایک خبری فلم پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی دکھائی گئی تھی۔

ایشین کے سیٹو کے نعم البدل میں تبدیل ہو جانے کے امکان کو سائرس وانس کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ امریکہ "ایشین" کے اتحاد کو بڑھانے میں مدد دے گا۔ اس کے علاوہ اس تنظیم کے تحت، جس کا مقصد اسکے قیام کے وقت خالص معاشی اور تہذیبی تعاون کا فروغ تھا۔ اب فوجی معاملات پر کانفرنسوں کا انعقاد اور اس کے آئندہ اجلاس کے ایجنڈے میں جو اس سال اگست میں کوالالمپور میں ہونے والا ہے، ممبر ملکوں کے درمیان قریبی فوجی تعاون کے سوال کی شمولیت بھی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہ تنظیم اب ایک فوجی بلاک کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ جس کی سرپرستی براہ راست امریکہ کی بجائے جاپان، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ برما اور بنگلہ دیش کو بھی اس تنظیم میں گھسیٹ لیا جائے۔ اس غرض سے آئندہ جاپانی وزیر اعظم جنوب مشرقی ایشیا کے دیگر ملکوں کے ساتھ ساتھ برما کا بھی دورہ کرنے والے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کی صورت حال اور برصغیر جنوبی ایشیا میں آنے والی حالیہ تبدیلیوں کے بعد برما علاقے میں تقریباً تنہا رہ گیا ہے۔ اور اس پر پہلے ہی چین کا بہت فوجی دباؤ ہے۔ اب یہ حالات ہی بتائیں گے کہ برما اس دباؤ کو کب تک سہہ سکے گا۔ اور اپنی غیر وابستگی، خارجہ پالیسی اور ملک کے اندر غیر سرمایہ دار ترقی کی معاشی پالیسیاں کو بچا سکے گا۔

بہر حال سیٹو کی متبادل صورت کوئی بھی نکلے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ فوجی و سیاسی بلاک ہمارے جیسے ترقی پذیر ملکوں کے آزادانہ ارتقاء کی راہ میں زبردست رکاوٹ اور ہمارے قومی اقتدار اعلیٰ کے منافی ہیں۔

پاکستان جو ۱۹۷۲ء تک نہ صرف سیٹو کا رکن تھا بلکہ ترکی کی طرح جو ناٹو اور سنٹو کے درمیان رابطہ کی کڑی ہے۔ پاکستان اور سیٹو کے درمیان رابطہ کی کڑی بھی تھا۔ ان فوجی بلاکوں کے مضر اثرات کا ایک سے زیادہ بار تجربہ کر چکا ہے۔ یہ فوجی بلاک اپنے رکن ترقی پذیر ملکوں کے داخلی معاملات میں کس طرح مداخلت کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال سنٹو کی وزارتی کونسل کے ۱۹۷۲ء میں ہونے والے اجلاس کے اعلامیہ کا وہ حصہ ہے، جو پاکستان کے بارے میں تھا۔ اس میں پاکستان میں جمہوریت کے قیام کو داخلی جارحیت اور تخریب کاری سے موسوم کیا گیا تھا اور مسٹر بھٹو کی حکومت نے اس اعلامیے کے مندرجات پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا۔ جس کا نتیجہ بلوچستان کے بحران

کی صورت میں نکلا۔ اور یہ بحران بالآخر خود مسٹر بھٹو کی حکومت کو لے ڈوبا۔

اب جبکہ ملک کو درپیش دیگر تمام مسائل کی طرح بلوچستان کے مسئلے کے تصفیہ کے لئے بھی سنجیدگی سے کوشش ہو رہی ہے تو یہ توقع رکھنی چاہئے کہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی حکومت ملک کی خارجہ پالیسی کے اس اہم مسئلہ پر بھی توجہ دے گی۔

موجودہ عبوری حکومت سے اس معاملے میں اس لئے بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے پہلے ہی واضح کر دیا ہے کہ اس کا کام صرف آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانا ہے۔ ملک کی داخلہ و خارجہ پالیسیاں وضع کرنا عوام کے ووٹ کے ذریعے منتخب ہو کر آنے والی آئندہ حکومت کا کام ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ پاکستان قومی اتحاد نے اپنے متفقہ انتخابی منشور میں ملک کو بڑی طاقتوں کی باہمی آویزشوں سے الگ رکھنے کے لئے سنٹو سے علیحدگی اختیار کرنے اور ایک آزاد اور غیر وابستہ خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ کیا ہے۔ اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قومی اتحاد کا وعدہ مسٹر بھٹو کا وعدہ نہیں ہوگا

بقیہ: مولانا رسول خان صاحب

متولی وقف ڈاکٹر محمد اقبال، جو پریس برانچ کے افسر اعلیٰ تھے۔ اور دوسرے مولوی ظفر اقبال جو محکمۂ تعلیم میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا استاد نہیں "پدر مشفق" جہان سے اُٹھ گیا ہے!

میں نے ان دونوں کو دیکھا کہ وہ آفس سے رخصت ہوتے ہی سیدھے حضرت کے مکان کا رخ کرتے۔ کتاب ان کی بغل میں ہوتی اور وہ سبقاً سبقاً کتابیں پڑھتے!

اپیل

جمعیۃ علمائے اسلام مملکتِ پاکستان میں اسلام کے عادلانہ نظام کی ترویج، نظام ہائے باطل کی تردید، فتنہ باطلہ کے مقابلے، فرنگی تہذیب کے قلع قمع اور اعلاء "کلمۃ الحق عند سلطان جائر" کے مقدس فریضہ کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف و منہمک ہے

جمعیۃ سے وابستہ و منسلک ہزاروں علماء و مشائخ اور لاکھوں انتھک جانباز، مخلص کارکن وسائل کی کمی کے باوجود شب و روز اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے تگ و تاز کر رہے ہیں۔ اسلام کی سربلندی اور ملکی سالمیت کے تحفظ کے لیے جمعیۃ علماء اسلام کی خدمات مسلّمہ ہیں تحریک بحالی جمہوریت، تحریک مقدس ختم نبوت اور تحریک نظامِ مصطفٰے اس پر شاہد عدل ہیں۔ جمعیۃ اپنا ایک تابناک ماضی رکھتی ہے اور روشن مستقبل کے لیے کوشاں ہے، لیکن نصرت الٰہی کے ساتھ ساتھ وسائل و اسباب کا ہونا بھی ضروری ہے خصوصاً موجودہ دور میں۔ لہٰذا جمعیۃ کی مخلصانہ سرگرمیوں کا مربوط اور سیاسی پلیٹ فارم کو مضبوط بنانے کے لیے جمعیۃ کے بیت المال کو مستحکم بنانا ازحد ضروری ہے۔

التماس اصحاب ثروت اور اہل خیر حضرات سے التماس ہے کہ وہ عطیات، صدقات اور خیرات کے ذریعہ بیت المال کی امداد فرمائیں۔ نیز بیت المال کیلئے **زکوٰۃ** کی فراہمی کا ہر جگہ اہتمام کر کے اس اہم فریضہ کی تکمیل کریں۔ اراکین جمعیۃ خصوصاً اس سلسلے میں تگ و دو کریں۔

(مولانا) محمد عبد اللہ درخواستی امیر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان
(مولانا) عبید اللہ انور امیر جمعیت علماء اسلام پنجاب
(مولانا) محمد ایوب جان بنوری امیر جمعیۃ علماء اسلام سرحد
(مولانا) مفتی محمود ناظم عمومی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان
(مولانا) سید محمد شاہ امروٹی امیر جمعیۃ علماء اسلام سندھ
(مولانا) عبد الواحد صاحب امیر جمعیۃ علماء اسلام بلوچستان

نوٹ: زکوٰۃ کی رقوم مولانا مفتی محمود ناظم عمومی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان چوک رنگ محل لاہور کے نام روانہ کیجیئں